

اکیسویں صدی میں اُردو تحقیق: صورتِ حال، تقاضے اور امکانات

Urdu Research in the 21st Century: Situation,
Needs and Prospects

ڈاکٹر محمد خاور نوازیش، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

Dr. Muhammad Khawar Nawazish, Assistant Professor,
Dept. of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

Abstract

This article is based on the idea that research is actually born out of curiosity, and that the 21st century's revolution of science and technology has sought to eradicate this human curiosity. Urdu scholars still invent topics, most of which are traditional. Topics revealed from in-depth studies are rare in Urdu at this point of time. As a result, Urdu research in Pakistani universities is based on repetition rather than the creation of new knowledge. Researchers are presenting analyzes with the help of knowledge and ideas created by the 1st world instead of examining external facts with the help of their inner feelings and cultural perspective. In this article, the author presents a theoretical discussion on the situation, requirements and prospects of research in 21st century with special reference to the subject of Urdu and tries to raise new questions as well as answer them.

Key words: Research, Urdu, 21st century, Pakistan, Researcher

کلیدی الفاظ: تحقیق، اردو، اکیسویں صدی، پاکستان، محقق

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسان کو مثبت یا منفی، نفع یا نقصان اور کم یا زیادہ کی
مدیریں جو دیا ہے اس پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب مزید گفتگو کی گنجائش تلاش کے بجائے کچھ
دیر خاموش رہ کر اپنے ارد گرد کا مشاہدہ کرنا زیادہ بہتر ہو گا۔ یہ مشاہداتی سرگرمی اکیسویں صدی

کی نسل کے لیے تو شاید زیادہ دلچسپ نہ ہو لیکن بیسویں صدی کا جنما ہوا ضرور اس عمل کے بعد مزید خاموش رہنے اور سوچنے کو ترجیح دے گا۔ بیسویں صدی کا آدمی اکیسویں صدی میں خود کو جس چیز سے محروم محسوس کرنے لگا ہے وہ ہے 'سوال'۔ وہ سوال جس کی بنیاد تجسس پر تھی۔ وہ تجسس جو اپنے ماحول کے مشاہدے سے جڑا ہوا تھا۔ وہ تجسس جو ہمارے اندر کیا ہے! کیوں ہے! کیسے ہے! کب سے ہے! ایسے سوالات پیدا کرتا رہتا تھا۔ یہ سوال ہی ہے جو انسان کو زندہ رکھتا ہے۔ یہی زندگی کی تحریک ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کا خیال ہو کہ محققین کو اپنے سوالات کے جوابات پا کر جو مسرت محسوس ہوتی ہے وہی حقیقی مسرت ہے۔ جبکہ دراصل ہر جواب کے اندر بھی ایک سوال ہوتا ہے اور اصل مسرت اُسی سوال کی تلاش ہے۔ وہی آپ کو زندگی دیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی یہ طے کر کے آئی ہے کہ ہمارے تجسس اور سوالات کو ختم کر دیا جائے۔ اس صدی میں وہی انسان حقیقتاً زندہ ہو گا جو اپنے تجسس اور سوالات کے خاتمے کی کوشش سے لڑتا رہے گا۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور بائیو ٹیکنالوجی کے انقلابات خارجی دنیا کے بعد اب ہماری اُس داخلی دنیا پر دسترس کی طرف بڑھ رہے ہیں جو تجسس اور غور و فکر کی دنیا ہے۔ عہد حاضر کے معتبر سوشل سائنسٹس یول نوح ہراری اپنی کتاب 21 Lessons For 21st Century میں لکھتے ہیں:

"ماضی میں انسانوں نے خارجی دنیا پر حکمرانی کی ہے لیکن داخلی دنیا پر بہت ہی کم کنٹرول رہا ہے۔ اگر مچھر نیند میں تنگ کریں تو ہم جانتے ہیں کہ کیسے مارنا ہے، مگر کوئی فکر یا خیال نیند اڑا دے تو ہم میں سے اکثر نہیں جانتے کہ کیسے اس خیال کو کچلا جائے۔ بائیو ٹیک اور انفو ٹیک انقلابات خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ داخلی دنیا پر بھی قابو پاسکے گا۔ ہم انسانی زندگی کو انجینئر اور مینوفیکچر کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ ہم جان سکیں گے کہ کس طرح دماغ کو ڈیزائن کرنا ہے، زندگی کی مدت بڑھانی ہے اور فکر و پریشانی کو کس طرح ختم کرنا ہے۔" (۱)

ہمارا ایسی باتوں کی طرف عمومی رویہ اولاً بے یقینی اور ثانیاً خوف سے پیدا ہونے والے شدید ردِ عمل کا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس انقلاب کا حصہ بھی بن رہے ہیں۔ آرٹی فیشل انٹیلی جنس آہستہ آہستہ ہمارے ایکشنز اور ری ایکشنز کو مانیٹر کر کے ایسا بگ ڈیٹا ترتیب دے رہی ہے جو مخصوص ریاضیاتی فارمولوں کے زیر اثر انسانی دماغ پر مکمل کنٹرول حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے میں ہمارے سوالات بھی مینوفیکچر ڈھوں گے اور اُن کے جوابات کی

تلاش صرف ایک مشینی سرگرمی بن کر رہ جائے گی نہ کہ مسرت کا سرچشمہ۔ سائنسی ترقی کی اب تک کی تاریخ اگر ایک طرف مشینوں کی ایجاد میں انسانی ذہن کی بے پناہ صلاحیتوں کا اظہار ہے تو دوسری طرف اُن مشینوں کے گوناگوں استعمال میں غیر دانشمندی اور غیر محتاطی کا بھی کھلا اظہار ہے۔ خدا معلوم یہ ترقی ابھی ہمیں کیا کیا دکھلائے گی اور مزید کہاں لے جائے گی لیکن اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے محسوسات بھی ہماری ملکیت نہ ہوں گے۔ بقول یعقوب عثمانی:

چاہتی ہے آخر کیا آگہی خدا معلوم

کتنے رنگ بدلے گی زندگی خدا معلوم

سننے اور پڑھتے آئے ہیں کہ ادب انسانی احساسات کے لطیف اظہار کا نام ہے۔ اگر اکیسویں صدی احساس کی صورت تبدیل کرتی ہے تو لطف کے معانی بھی بدلیں گے اور یوں اس صدی کا ادب جس انفرادیت کا حامل ہو گا وہ لحاقی تاثر ہے۔ یہ اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی کہ ٹیک ٹاک جزیشن ایک ہزار سے زائد صفحات کا 'وار اینڈ پیس' پڑھنے میں دلچسپی رکھتی ہے نہ ہی 'کاجل کوٹھا'۔ اس جزیشن کے پاس ایک جگہ ٹھہراؤ کا کل دورانہ چند سیکنڈز ہیں۔ اُنھی چند سیکنڈز میں کسی ایک ٹویٹ یا فیس بک پوسٹ یا کسی موٹیویشنل سپیکر کے ایک جملے نے اپنا کوئی تاثر قائم کرنا ہے تو کر سکتا ہے بصورتِ دیگر سب کچھ دماغ کی ٹریش کین میں چلا جاتا ہے۔ غور کریں تو ہماری نئی نسل کے ذہنوں کو پڑھ کر یاد رکھنے کے بجائے دیکھ کر یاد رکھنے کا عادی بنادیا گیا ہے۔ بظاہر یہ معاملہ انسان کو ذہنی مشقت سے آزاد کر کے تساہل پسند بنادینے کا لگتا ہے لیکن درحقیقت یہ اُس کے ذہن کو ہزاروں میگا بائٹ ڈیٹا سے بھر دینے کا عمل ہے۔ جس کے بعد ہر شخص کو یہ سوچ بالکل جائز لگتی ہے کہ وہ نہ صرف دوسرے انسانوں سے زیادہ جانتا ہے بلکہ اپنے سے پہلی نسلوں سے بھی بہت زیادہ علم رکھتا ہے۔ معلومات کا فریب ہماری موجودہ دنیا کا سب سے بڑا فریب ہے اور اس فریب کا سب سے بڑا شکار انسانی تجسس ہے۔ وہ تجسس جو اپنے ماحول کے مشاہدے سے پیدا ہونا تھا اور جس نے انسان کے تخیل کو اپنی کارفرمائی کے ذریعے مختلف تصاویر ترتیب دینے اور پھر انھیں صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کی طرف لانا تھا اُسے اُن واٹڈ فلو آف نالج کے نیچے دبایا جا رہا ہے۔ سوال خواہ اپنی خام حالت میں ہی ہو گوگل اُس کا کچھ نہ کچھ جواب گڑھ کر سامنے رکھ دیتا ہے۔ تجسس کے خاتمے کے ساتھ ہی دوسرا کام تشویش کے وجود پر ضرب کاری ہے۔ اب ذرا سوچیے کہ ان دونوں بنیادی انسانی جبلتوں پر ایلیگور تھم کی

حکومت کے بعد ادب کی تخلیق کی کہانی کیا ہوگی! اور اگر ادب کی تخلیق پر یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے تو ادبی تحقیق پر کیوں نہیں!

ادبی تحقیق کی اساس بھی تجسس ہے۔ امریکی مورخ اور نقاد ہارڈمفورڈ جونز کہتے

ہیں:

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہمارا کام تجسس کے عاجزانہ جذبے کے ذریعے یہ دریافت کرنا ہے کہ ادبی شہ پارے حقیقت میں کیا کہتے ہیں۔" (۲)

رچرڈ ڈینیل آلک 'دی آرٹ آف لٹری ریسیرچ' میں لکھتے ہیں:

"حقیقی سکالر ایک گہرے اندرونی تجسس، سیکھنے اور اس کے ساتھ ہی سکھانے کی ایک ناقابل تردید خواہش کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے اور وہ خوشی خوشی سیکھتا ہے.... اگرچہ اب دریافتیں اتنی تیزی سے نہیں ہو رہیں جتنی تیزی سے پہلے ہو رہی تھیں تاہم دستیاب مواد کی بنا پر یہ امر یقینی نظر آتا ہے کہ اگر مناسب معیار کا تخیل، حکمت عملی کا اچھوتا پن، علم کی پختگی (تاکہ بے کار قسم کی دریافتوں سے بچا جاسکے) اور ادبی فن اور تخلیق کاروں کو نئے تناظر سے دیکھنے کی خواہش اور ارادہ موجود ہو تو اس شعبے کی طرف آنے والے ہر ایک فرد کے لیے مفید قسم کی سرگرمیوں کی کافی گنجائش موجود ہے۔" (۳)

ان دونوں علما نے جس تجسس، خواہش اور ارادے کو سیکھنے کی جستجو کی بنیاد کہا ہے، ہماری آج کی اُردو دنیا اور بالخصوص تحقیق کے میدان میں وہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ تحقیق کا بڑا مرکز ادارے ہوتے ہیں اور افسوس ناک حقیقت حال یہ ہے کہ ہمارے اداروں میں ہی تحقیق خواب بنتی جا رہی ہے۔ ایک طرف محققین کی ایمپیکٹ فیکٹر کا انشیس نسل ہے تو دوسری طرف ایسے ادارے جنہیں تحقیقی معیار کے بجائے پبلشنگ فیس سے دلچسپی ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق کی وجہ سے اُردو زبان و ادب کی اعلیٰ ڈگریاں ایک مذاق بنتی جا رہی ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ مقالے لکھنے والے اور لکھوانے والے دونوں اس بات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ سب سے پہلے موضوعات کو لے لیجیے۔ وہ زمانہ گیا جب موضوع سوجھتا ہوگا، اب موضوع گڑھا جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ اس پر مواد کی دستیابی کی صورت کیا ہوگی۔ موضوع سوجھنے کا تعلق مشاہدے اور مطالعے سے ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے یہاں

اہتری کا شکار ہیں۔ جس معاشرے سے پڑھنے اور سننے کا رواج رخصت ہو رہا ہو وہاں چیزوں کے بارے میں تجسس اور اس کے نتیجے میں سوال پیدا ہونا بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی سوال قسمت سے ذہن میں ابھرے بھی تو گوگل سرچ انجن فوراً اس کا گلاب دیتا ہے۔ چلیے گوگل کے جواب کو ہی لے لیجیے، اُس جواب پر تشکیک کی نگاہ ڈالنے کی بھی کوئی تربیت نہیں کیونکہ جیسا کہ پہلے بھی بیان ہوا آیا ہماری نئی نسل کے ذہن کو ایک سوال پر صرف چند ہی سیکنڈز ٹھہرنے کا عادی بنا دیا گیا ہے۔ انھیں گوگل کے ذریعے سامنے آنے والے سچ سے آگے اور پیچھے موجود سچ کے وجود سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بیشتر کے لیے تحقیق کا مطلب آج بھی درست توارخ پیدائش اور وفات کی تلاش ہے جب کہ دنیا ٹر تھ اور پوسٹ ٹر تھ کی بات کر رہی ہے۔ جدید ادبی تحقیق اب دریافتوں سے آگے نکل کر تجزیے اور تنقید کے ساتھ بھی مضبوط رشتہ استوار کر چکی ہے اور اس حقیقت کو سمجھنے بغیر تحقیق کا سب سے بڑا مقصد حاصل کرنا یعنی نئے اور تازہ علم کی پیداوار ممکن نہیں۔ اس وقت یونیورسٹیوں میں لکھے جانے والے مقالات میں سے بمشکل دس فیصد ایسے ہوں گے جو تحقیق کے مذکورہ بالا مقصد پر پورے اتر سکیں بقیہ صرف معلومات، مباحث اور نتائج کی تکرار ہیں۔ ایم فل بلکہ پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق کرنے والے بہت سے طلباء اپنی تحقیق کا مفروضہ بیان نہیں کر سکتے کیونکہ انھوں نے قائم ہی نہیں کیا ہوتا اور جنھوں نے قائم کیا ہو وہ عموماً سچ ثابت کرنے کے لیے ہی کیا ہوتا ہے۔ تحقیقی مقالات کے آغاز سے اختتام تک استعمال ہونے والے اسمائے صفات کا الگ کتابچہ ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ یہ معاملہ تحقیق تک ہی محدود نہیں ہمارے یہاں تو علم بھی دراصل اثبات کے لیے حاصل کیا اور دیا جاتا ہے، نفی کے لیے علم حاصل کرنے اور دینے کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔ معروضیت تحقیق کی بنیادی قدر ضرور ہے لیکن ہمارے یہاں اس کی بات ہی عبث ہے کیونکہ محققین اپنے موافق موضوع لیتے ہیں، پھر موافق مواد اکٹھا کیا جاتا ہے اور نتائج وہی نکالے جاتے ہیں جو مقالہ شروع کرنے سے پہلے ہی ذہن میں ہوں۔ کون سوچتا ہے کہ ہر وہ خیال جو ہم نے کسی بھی شے کے بارے میں اپنے ذہن میں بنا رکھا ہے دراصل ہماری لاعلمی پر مبنی ہے اور ہمیں تحقیق کا آغاز ہے انحراف سے کرنا ہے۔ جامعات میں جن اساتذہ کی نگرانی میں تحقیق ہوتی ہے وہ خود اپنی ترقی کے لیے مقالات کی تعداد پوری کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ تحقیق کی اس اہتر صورت حال کے سیاق میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن نامی ریگولیٹری اتھارٹی کی پالیسیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس کے نتیجے میں معیار کی اہمیت مقدار کو حاصل ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر سرفے کے حوالے سے ہی ایچ ای سی کی پالیسی کو لے لیجیے۔ سرفے چیک کرنے کے لیے ایک سافٹ

وئیرٹرن اٹ ان متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ سافٹ ویئر صرف الفاظ کا سرقہ پکڑتا ہے جسے ذرا سا رد و بدل سے کلیئر کیا جاسکتا ہے اور سندی تحقیق میں یہ روش عام ہے۔ خیالات اور نظریات کا سرقہ کون چیک کرے گا۔ اس پر وہ سافٹ ویئر خاموش ہے۔ اب یہ ذمہ داری ایک دفعہ پھر محقق کی اخلاقیات اور دیانتداری کی سطح پر آجاتی ہے یا پھر نگران مقالہ کے مطالعے کی وسعت پر۔ ہمارے یہاں جامعات میں ہر سطح کی عملی تحقیق کے آغاز سے پہلے ایک کورس ورک بھی کرایا جاتا ہے جس کا بنیادی مقصد طلباء کے ذہن کو تحقیق کے لیے پوری طرح تیار کرنا ہوتا ہے لیکن اُسے بہت سرسری انداز میں لیا جاتا ہے۔ اُردو میں ریسرچ میٹھڈالوجی پڑھانے پر توجہ کم ہونا بھی مذکورہ مسائل کی ایک وجہ ہے اور جہاں جہاں یہ کورس پڑھائے جا رہے ہیں وہاں آج بھی طلباء گین چند جین کی 'تحقیق کا فن' یا ایم سلطانیہ بخش کی 'اُردو میں اصول تحقیق' وغیرہ ایسی کتابوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اس پر کوئی دوسری رائے نہیں کہ یہ کتابیں بہت اہم اور بنیادی نوعیت کے اہم مباحث پر مشتمل ہیں لیکن تحقیق اب ان مباحث سے بہت آگے نکل چکی ہے سو جب تک اُردو کے طلباء اور محققین نئے نالج سے مستفید نہیں ہوں گے وہ تحقیق کے جدید معیارات کو نہیں پہنچ سکیں گے۔

اکیسویں صدی کے ابتدائی بیس برسوں میں اُردو تحقیق کی دگرگوں صورت حال کو دیکھتے ہوئے ماسوائے اپنی سمت میں تبدیلی لانے کے کوئی اور چارہ نظر نہیں آتا اور اس کا آغاز بین العلومی اور بین اللسانی مطالعات سے ہونا چاہیے۔ اُردو تحقیق کی ثروت مندی کا انحصار نئے سوالات کے پیدا ہونے اور اُن کے جوابات کی تلاش میں نئے ادبی ایوانوں کا رخ کرنے پر ہے۔ یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے کہ ہمارے طلباء اور محققین اپنے تحقیقی مقالات کے مجوزہ موضوعات (اشخاص) کے زندہ ہونے پر اس لیے مشوش ہوں کہ ان کا مقالہ مکمل ہونے کے بعد اگر موضوعہ شخصیت کی کوئی کتاب شائع ہوگئی تو اُن کے نتائج اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس صورت حال سے نکلنے کے لیے کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ موضوعہ شخصیت کے تخلیقی ادب کا کسی دوسری زبان میں لکھنے والے کے تخلیقی ادب سے موازنہ کیا جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے محقق کو ایک سے زائد زبانیں آنا ضروری ہیں۔ اُردو ادب کا مقامی زبانوں کے ادب اور عالمی ادب کے ساتھ موازنے کا رجحان ابھی تک کم ہے۔ ہمارے محققین کو شخصیت اور فن ایسے موضوعات کو کچھ عرصے کے لیے ترک کر کے تقابلی مطالعات کی طرف آنا ہوگا۔ اسی طرح اُردو تحقیق کو تازگی کے لیے تاریخ، فلسفہ، نفسیات، عمرانیات، بشریات، سیاسیات، جینڈر اسٹڈیز، اکنامکس، ماحولیات اور فائن آرٹس ایسے علوم اور شعبوں کے ساتھ اپنا رشتہ گہرا

کرنا ہو گا کیونکہ اسی طرح نئے سوالات اور اُن کے نتیجے میں نیا علم پیدا ہونے کی راہیں کھلیں گی۔ ہمارے محققین کو بس اپنے تجسس کو بچانا ہے۔ انھیں اکیسویں صدی کی سائنسی ترقی اور عالمگیریت کے استحکام کے ساتھ بچھائے جانے والے گھڑے گھڑائے حقائق کے جال میں خود کو پھنسے سے بچانا ہو گا۔ انھیں بقول ہراری طاقت کے اُس بلیک ہول سے فرار ہونا ہو گا جس میں رہتے ہوئے اگر اُس کے ہاتھ میں ہتھوڑا ہو گا تو ہر چیز کیل ہی نظر آئے گی۔ وہ لکھتا ہے:

"اگر تم سچ جاننا چاہتے ہو تو طاقت کے بلیک ہول سے فرار ہونا ہو گا اور ادھر ادھر علم تلاش کرنا ہو گا۔ آنے والی دہائیوں میں دنیا مزید مشکل ہو جائے گی۔ بادشاہ اور مہرے دونوں ہی جدید ٹیکنالوجی سے نابلد ہوں گے۔ معاشی اور سیاسی حرکیات سے ناواقف ہوں گے۔ جیسا کہ دو ہزار سال پہلے سقراط نے جانا تھا کہ بہترین علم یہ ہے کہ اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا جائے۔" (۴)

اگر لاعلمی کا اعتراف کرنے اور جاننے کی خواہش سے قطع نظر طاقتوروں کے پیدا کردہ علم اور نظریات پر ہی بھروسہ رکھا گیا تو ہمارا محقق تازہ علم پیدا کرنے میں ناکام رہے گا۔ اُسے اپنے آپ پر سب سے زیادہ بھروسہ کرنا ہو گا۔ خارجی حقائق کا سرچشمہ اُسے اپنے باطن میں ہی نظر آئے گا، سوال وہیں سے پھولے گا اور سوال زندہ ہے تو تحقیق زندہ ہے۔ محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

"اگر آپ کے نزدیک آدمی کے اندرونی تجربے اور اس کے خارجی عمل میں کوئی علاقہ نہیں تب تو بات ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن اگر ان دونوں کے درمیان کوئی ربط ہے تو داخلی تجربات پر غور کئے بغیر آپ خارجی عمل اور سماجی حقیقت پر اس کے اثر کا ادراک حاصل کر ہی نہیں سکتے.... ظاہر کی چیزوں میں سماجی حقیقت بھی شامل ہے اور کائنات بھی، خود آگہی کے ہر عمل میں ان دونوں چیزوں کا ادراک کسی نہ کسی حد تک ضرور شامل ہوتا ہے یعنی جس چیز کو نقاد اپنے آپ میں کھوجانا کہتے ہیں خارجی حقیقت سے رشتہ قائم کرنے کا ذریعہ ہے بشرطیکہ آدمی سچ مچ اپنے آپ میں کھوسکے۔" (۵)

ہمارے محقق کا سب سے بڑا مسئلہ ہی اپنی ذات پر اعتماد کا فقدان ہے۔ اُسے اپنے مفروضے (اگر کوئی قائم کیا ہو) کے اثبات کے لیے داخلی اور خارجی شہادتیں چاہیے ہوتی ہیں

یا پھر اُس کی تمام توجہ اپنی موضوعہ شخصیت کے کسی غیر مطبوعہ کلام کی تلاش پر مبذول رہتی ہے جس کے نتیجے میں مطبوعہ اور دستیاب کلام کے اندر سے اُس شخصیت کے نئے وجود کی دریافت یا اُس بیانیے کی تلاش جس کے زیر اثر وہ کلام تخلیق ہوا ممکن نہیں ہو پاتی۔ یوں ایک پھسپھا تحقیقی مقالہ سامنے آتا ہے جس پر نگرانِ مقالہ کا نام دیکھ کر ممتحن رپورٹ لکھتا ہے اور مقالہ نگار کو ڈگری دینے کی سفارش کرتا ہے۔ اور یہ صورت حال اُس دور کی ہے جب ادبی محققین کو پچھلے تمام ادوار سے کہیں زیادہ سہولیات اور آسائشیں میسر ہیں۔ اُردو کی نایاب کتب، رسائل و جرائد، اخبارات، انٹرویوز سب کچھ انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ محقق کے لیے دنیا کے کسی بھی ملک کی لائبریری سرچ کرنا اور وہاں سے کتاب کا حصول کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہا۔ ٹھیک اسی طرح آپس میں رابطے بہت آسان ہو چکے ہیں۔ برقی آلات نے ڈیٹا کی ترتیب کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے متون کو ترجمہ کرنے تک کی سہولت مہیا کر دی ہے۔ لیکن اس تمام سرمایے کے حقیقی تشنگان بہت کم تعداد میں نظر آتے ہیں اور جو ہیں اُن کے ذہن واٹس ایپ، فیس بک، ٹویٹر، انسٹاگرام اور یوٹیوب نے ہزاروں میگا بائٹ ڈیٹا سے ایسے بھر دیے ہیں کہ نئی معلومات حافظے پر بوجھ محسوس ہوتی ہے۔ اکیسویں صدی کے محقق کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہی یہ ہے کہ وہ عالمگیریت کے مذکورہ تحائف کی طرف سے دماغ میں ٹھونس ہوئی ردی کو باہر پھینک کر اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر ابھرنے والے احساسات اور خیالات کو ذہن میں جگہ دینے کی کوشش کرے۔ اُسے اپنے ثقافتی احساس سے ہی وہ آگہی مل سکتی ہے جو ادبی تحقیق میں بھی اُس کے لیے نئے دروا کرے گی۔ اسی طرح اداروں کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آئی ایس او (انٹرنیشنل آرگنائزیشن فار سٹینڈرڈائزیشن) یا ایم ایل اے (ماڈرن لینگویج ایسوسی ایشن) کی طرز پر کوئی ایک ایسا پلیٹ فارم بنالیں جہاں اور کچھ نہیں تو کم از کم دنیا بھر کی جامعات میں ہونے والی اُردو کی ادبی تحقیق کا ایک ڈیٹا بیس موجود ہو تاکہ ہر محقق اپنے ذہن میں ابھرنے والے موضوع پر اس سے پہلے ہو چکے کام سے آگاہ ہو سکے۔

اکیسویں صدی انسان کو نئے علوم کی دریافت اور نئے سماجی بیانیوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ زبانوں اور ان میں پہلے سے موجودہ علوم کو ٹیکنالوجی جانز کرنے کی طرف بھی لا رہی ہے۔ یونی کوڈ کی ایجاد سے اُردو زبان نے بڑی حد تک اپنے آپ کو اکیسویں صدی کی دوڑ میں شامل کر لیا ہے۔ ہم انٹرنیٹ پر اُردو لکھنے کی سہولت کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری زبان کی عالمی سطح پر اشاعت سے الگ شناخت مستحکم ہو رہی ہے حالانکہ تصویر کا ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ انگریزی میں روانی نہ ہونے کی وجہ سے ہم آرٹی فیشل انٹیلی جنس کو اپنے بارے میں شاید اتنی

جلدی اور اتنا زیادہ ڈیٹا دیتے جتنا اُردو لکھنے کی سہولت ملنے سے اسے بہم پہنچا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں چونکہ فی الوقت ایسی کسی تشویش میں مبتلا ہونے کی بجائے یونی کوڈ کی ایجاد سے اُردو کی ادبی تحقیق کے میدان میں روشن امکانات پر نظر رکھنی ہے سو ہم اسے اکیسویں صدی کا اب تک کا اہم ترین کارنامہ تصور کر سکتے ہیں۔ اس پر بھی کوئی دوسری رائے نہیں کہ یونی کوڈ نے اُردو رسم الخط کو عالمگیریت کے ریلے میں بہہ جانے سے بچایا ہے۔ ۲۰۰۱ء میں ڈاکٹر عطش درانی صاحب کی قیادت میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی کوششوں سے اُردو ضابطہ تختی (UZT) سٹینڈرڈائز ہوئی اور تمام الیکٹرانک ڈیوائسز میں اس کا استعمال ہونے لگا۔ سب سے پہلے NADRA نے اس کا استعمال شروع کیا پھر مائیکروسافٹ نے اسے اپنے آپریٹنگ سسٹمز کا حصہ بنایا۔ آج یہ Perso Arabic Script کا حامل کی بورڈ اس خطے کی دیگر علاقائی زبانیں لکھنے کے لیے بھی مستعمل ہے اور تحقیق کے نئے دروا کر رہا ہے۔ ٹیکنالوجی کے موجودہ عہد سے لے کر اکیسویں صدی کے وسط تک متوقع انقلابات تک اگر ہم اپنے داخل کی دنیا کو تھوڑا سا بچانے میں بھی کامیاب رہے تو مشاہدے کی حقیقی قوت کے ساتھ نئے علم کی تخلیق کی امید باقی رہے گی اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر اُردو دنیا اپنے تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ تنقید اور تحقیق کے جزیرے بچانے میں بھی کامیاب ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ہراری، یوول نوح، اکیسویں صدی کے اکیس سبق، (ترجمہ: ناصر فاروق)، کراچی: بک ٹائم، ۲۰۱۹ء، ص ۱۵

2. Jones, Howard Mumford. "Graduate English Study: Its Rationale.", The Sewanee Review, Vol. 39, No. 1, 1931, P. 76.
[Cited through:
<https://www.jstor.org/stable/27534610>. Accessed:
18 Oct. 2020]

۳۔ آلنک، رچرڈ ڈینیئل، ادبی تحقیق کا فن، (ترجمہ: اعجاز باقر)، اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۸ء، ص ۷۱

زبان و ادب، شمارہ ۲، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

۴۔ اکیسویں صدی کے اکیس سبق، ص ۱۰۳-۱۰۴

۵۔ محمد حسن عسکری، ستارہ یا بادبان، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۷،
ص ۶۵-۶۶